داور خان داؤد

جدید پشتو ادب پر ایک طائرانہ نظر

جب انگریز سامراج نے اپنے استعماری عزائم کو عملی جامہ پہنانے اور پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے بر صغیر پاک و ہند میں اپنے قدم جمالئے ' تو وہ یہاں کے عوام کو اپنی گرفت میں لینے اور محکوم و غلام بنانے کے لئے طرح طرح کے سیاسی اور انتظامی حربے آزمانے اور استعمال کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہو گئے ۔ یہ سب کچھ صرف اسی وقت ممکن تھا جب وہ مقامی لوگوں کی بولیاں اور زبانیں سیکھیں ۔ تاکہ ان کی مدد سے وہ ان کی نفسیات ' مزاج ' رسم و رواج ' عقائید ' عادات ' توہمات وغیرہ سے روشناسی حاصل کر سکیں ۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں کی طرح انہوں نے پشتونوں کی زبان کو بھی سیکھنے کا ایک منظم اور مربوط پروگرام بنایا ۔ اس پروگرام کے تحت انہوں نے بعض مقامی علماء اور اہل قلم کی خدمات بھی حاصل کیں اور ان سے پشتو زبان کے قواعد ' محاوروں اور ضرب الامثال پر کتابیں لکھوائیں ۔ پشتونوں کی ثقافت پر مبنی کہانیوں اور طنز و مزاح پر بھی کتابیں تصنیف کروائیں ۔ کلاسیکی شعراء کے کلام اور (فوک لور) (Folklore) کا انتخاب بھی شائع ہوا ۔ ترجمے بھی کئے گئے ۔ تاریخ پر بھی کام کیا گیا ۔ پشتو اور انگریزی لغات بھی مرتب کئے گئے ۔ انگریزوں کو پشتو زبان سکھانے کے لئے بھی آسان اور عام فہم کتابیں لکھی گئیں ۔ اس کام کی ابتدا پادری ہیوز اور میجر راورٹی نے مولوی احمد اور منشی احمد خان کی رفاقت میں کی اس طرح پشتو زبان و ادب میں تنقید اور تحقیق کا آغاز ہوا ۔ یہی وہ زمانہ ہے جسے ہم جدید پشتو ادب کے آغاز اور ابتدا کے دور سے موسوم کرتے ہیں ۔ چنانچہ مولوی احمد کی "روضۃ الامثال" (پشتو ضرب الامثال کا مجموعہ) "گنج پشتو" اور منشی احمد جان کی "د قصہ خوانی گپ" (قصہ خوانی کا گپ) اور "هغه دغه" (ایسا ویسا) مشہور تصانیف ہیں ۔ جو کہ جدید پشتو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں ۔ متذکرہ مستشرقین کے علاوہ اور بھی کئی مستشرقین پشتو زبان و ادب کی ترویج و ترقی میں پیش پیش تھے ۔ مثلاً سر اولف کیرو ' بڈلف ' گلبرٹ سن ' ایس ۔ ایس تھاربرن ' کپتان واگن ' ڈاکٹر ہربرٹ پنزل ' ڈاکٹر میکنزی ' پروفیسر مورگنسٹائن ' ڈارمسٹیز ' جنرز الولڈسن وغیرہ ۔ بہرحال مذکورہ مستشرقین کی ان علمی اور ادبی کاوشوں کو کسی لحاظ سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ۔

چنانچہ بیسویں صدی کے شروع سے جدید پشتو ادب کا باقاعدہ آغاز ہوا ۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اس میں مزید پیش رفت ہوئی ۔ یہاں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پشتو ادب میں ایک عرصے سے غیر ملکی تسلط اور کم علمی کی وجہ سے سماجی اور سیاسی شعور کا فقدان رہا ۔ لیکن اب تاریخی ' سیاسی ' سماجی اور نظریاتی شعور نے پشتو ادب کے ہر پہلو کا

احاطہ کیا ہوا ہے ۔ جہاں نئے خیالات ' نئے مشاہدات اور عصری علوم نے مروج اصناف میں ہیت کی تبدیلیوں کو مد نظر رکھا ' وہاں نئی اصناف کو بھی رائج کیا گیا۔ چنانچہ ڈراما ' ناول ' افسانہ ' طنزو مزاح ' آزاد نظم ' سفرنامہ ' رپورتاژ ' وغیرہ نے پشتو ادب کو جدید اصناف سے روشناس کرایا۔

انگریزوں کے سیاسی غلبے اور اقتدار کے خلاف پشتون اہل قلم بھی صف بستہ ہو گئے اور انہوں نے سیاسی اور اصلاحی نوعیت کی نظمیں اور غزلیں لکھیں اور یوں اپنے جذبات اور احساسات عوام اور حکومت وقت تک پہنچاتے رہے ۔ ان شعراء میں محمد اکبر خادم ' عبدالخالق خلیق ' عبدالاکبر خان اکبر ' فضل محمود مخفی ' فضل رحیم ساقی ' عبدالمالک خان فدا ' غنی خان ' میاں احمد شاہ پیرنثر ' اجمل خٹک ' ولی محمد طوفان اور کرامت شاہ فولاد کے نام قابل ذکر ہیں ۔ مذکورہ شعراء اپنی شاعری کے ذریعے قوم کو بیداری اور جانبازی کا درس دیتے رہے اور حب الوطنی کے جذبے کو فروغ دینے کے لئے ترانے اور قومی نظمیں لکھنا اپنا اولین فرض سمجھتے رہے۔

اسی دور میں ہمیں سید رسول رسا ' فضل حق شیدا ' اشرف مفتون ' یونس خلیل اور ارباب ہدایت اللہ جیسے آفاق ادب کے علمبردار شعراء بھی نظر آتے ہیں ۔ یہ وہ شعراء ہیں جنہوں نے سب سے پہلے پشتو نظم کو جدت ' تنوع اور فنی تجربوں کی طرف مائل کیا اور اس میں فکری اور معنوی جدت پیدا کی ۔

اگرچہ حمزہ شنواری سے بھی پہلے جدید شاعری کا آغاز ہوا تھا ' لیکن اس نے پشتو غزل کی آبیاری جس طرح اپنے خون جگر سے کی ہے ' اس کی نظیر نہیں ملتی ۔ لہذا حمزہ شنواری بیسویں صدی کی وہ قد آور اور مشہور شخصیت ہیں ' جس کی غزل قدیم اور جدید روایات اور نظریات کے امتزاج کی منہ بولتی تصویر ہے ۔ اس کی غزل میں جہاں قدیم روایات کی پیروی کی گئی ہے ' وہاں وہ عصری آگہی اور نظریاتی شعور کی بھی ترجمانی کرتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ " شہنشاہ متغزلین " اور " بابائے پشتو غزل " جیسے ناموں سے موسوم کئے گئے ہیں ۔ اس کے بے شمار اشعار ایسے ہیں جو غیر فانی حیثیت حاصل کر چکے ہیں ۔ جس طرح سید امتیاز علی تاج کی " انار کلی " نے مصنف کی زندگی میں کلاسیک کا درجہ حاصل کیا ہے اسی طرح سے حمزہ شنواری کی غزل کو بھی اس کی زندگی ہی میں کلاسیک کا مقام حاصل ہوا ہے ۔

غزل میں جدیدیت کا نام زبان و بیان ' لب و لہجہ ' موضوع و مواد ' انداز فکر و طرز احساس اور زندگی کی طرف رواجی رویئے میں تبدیلی پیدا کرنا ہے اور یہ تبدیلی حمزہ شنواری کے یہاں نہایت واضح شکل میں ملتی ہے ۔ علاوہ ازیں ایک منفرد اسلوب اور ہیت کی وجہ سے وہ ایک ایسے مکتبہ فکر (School of thought) کے امام سمجھے جاتے ہیں ۔ جس کی پیروی اور تقلید کو پشتو کے بیشتر شعراء نے باعث فخرو افتخار سمجھا ہے ۔ اکثرو بیشتر حمزہ شنواری کی شاعری میں اس کی مشکل پسندی کو نشانہ تنقید بنایا جاتا ہے ۔ یہ مشکل پسندی وہاں زیادہ نمایاں اور واضح ہے ' جہاں وہ تصوف کے اسرار و رموز کو غزل کے پیکر میں سموتے ہیں ۔ لیکن در حقیقت اس کی مشکل پسندی ہی میں تغزل کے جملہ کوائف موجود ہیں ۔

غزل کے علاوہ حمزہ شنواری نے ایک ڈراما نگار کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی ہے ۔ اس نے ریڈیو کے لئے بے شمار ڈرامے لکھے ہیں ۔ ناول اور افسانے پر بھی طبع آزمائی کی ہے ۔ علم تصوف پر اردو اور پشتو میں بے شمار کتابیں بھی لکھی ہیں ۔ وہ ایک مترجم کی حیثیت سے بھی پہچانے جاتے ہیں ۔

سمندر خان سمندر بھی اسی دور سے تعلق رکھتے ہیں ۔ وہ علم عروض کے عالم ہیں اور پشتو شعر و ادب میں اس نے عروضی شاعری کی طرح ڈالی ہے اور یوں پشتو شاعری کو عروضی اشعار سے آشنا کیا ہے ۔ لیکن اپنی شاعری میں اس نے خود ہی اس کی پیروی کی ہے ۔ بہت کم شعراء اس کی تقلید اور پیروی سے مستفید ہوئے ہیں ۔ کیونکہ بیشتر شعراء عروضی شاعری کو پشتو شاعری کے مزاج کے منافی سمجھتے ہیں ۔ اس کی لکھی ہوئی مشہور نظم " دروند پختون " (قد آور پشتون) اس شاعری کی بہترین مثال ہے ' جو بے حد پسند کی گئی ہے ۔ اس نے علم عروض پر ایک جامع تحقیقی کتاب " ژور سمندر " (گہرا سمندر) بھی لکھی ہے ۔ اس نے پشتو نظم کو جس معیار اور مقام تک پہنچایا ہے ' اس سے متاثر ہو کر پشتو کے بڑے بڑے شعراء نے ایک ادبی محفل میں اس کی ایک نظم " تصویر جانان " سن کر اسے " ملک الشعراء " کا خطاب دیا ۔ چونکہ سمندر خان سمندر نے موضوع اور معنی کے لحاظ سے پشتو نظم کو ایک منفرد انداز بخشا ہے اور اسے عروضی شاعری کا بانی بھی سمجھا جاتا ہے ' اس لئے وہ پشتو ادب میں انفرادیت کا مالک ہے ۔

سمندر خان سمندر نے ریڈیائی ڈرامے بھی لکھے ہیں اور ایک مترجم کی حیثیت سے بھی شہرت حاصل کی ہے ' اس نے کلمہ طیبہ کی منظوم تفسیر " د توحید ترنگ " (توحید کا نغمہ) کے نام سے لکھی ہے جو دس جلدوں میں حال ہی میں شائع ہوئی ہے اور چونسٹھ ہزار ۶۴٬۰۰۰ اشعار پر مشتمل ہے ۔ اس کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۳۵ ہے ۔

قلندر مومند نہ صرف شاعر بلکہ نقاد ' محقق ' مولف ' مترجم اور افسانہ نگار بھی ہیں ۔ لیکن زیادہ شہرت اس نے ایک شاعر اور محقق کی حیثیت سے حاصل کی ہے ۔ شاعری میں وہ ایک ایسے مکتبہ فکر سے متاثر ہیں جو ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھتا ہے اور جس کی بنیاد سماجی اور معاشی ناانصافی ' طبقاتی کشمکش اور استحصال کے خلاف آواز اٹھانے پر استوار کی گئی ہے ۔ چنانچہ قلندر مومند کے اس مکتبہ فکر نے پشتو کے بہت سے شعراء کو متاثر کیا ہے ۔ اس نے اپنی غزل اور خاص کر نظم میں عصری تقاضوں کا جس خوبصورتی سے اظہار کیا ہے ' پشتو شعر و ادب میں اس کی مثال ملنی مشکل ہے ۔ اس کے شعری مجموعے " سباؤن " میں اس قسم کے بے شمار فن پارے موجود ہیں ۔ مثال کے طور پر " فریاد " ' " شاعرہ! (اے شاعرہ!) ' " اسلم شہید " ' " د مور پہ نوم " (ماں کے نام) ' " سلام " ' " حسن " ' " روبل " ' " زیرے " (خوشخبری) وغیرہ ۔

ٹی ۔ ایس ۔ ایلیٹ نے اچھی شاعری کی ایک خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ پڑھنے میں اچھی لگے ۔ یعنی مطالعہ یا پڑھنے کے قابل (Readable) ہو ۔ قلندر مومند کی تمام تر نظمیں اس معیار پر پوری اترتی ہیں ۔ یعنی وہ پڑھنے والوں کے ذوق شعری کو آسودہ کرتی ہیں ۔ اس لئے ان میں اچھی اور سچی شاعری کا حق ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے ۔ بہرحال حمزہ اور قلندر کے مکاتب فکر نے جدید پشتو شعراء کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ۔ کسی نے ایک اور کسی نے دوسرے کے مکتبہ فکر سے شعری بصیرت حاصل کی ہے ۔ بعض شعراء ان دونوں سے بیک وقت متاثر ہیں ۔ لیکن ایک گروہ ایسا بھی ہے ' جو ان میں سے کسی سے بھی متاثر نہیں اور جنہوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ راہ نکالی ہے ۔

مذکورہ شعراء کے علاوہ جدید پشتو شاعری میں بیشتر نامور شعراء نے بھی گرانقدر اضافے کئے ہیں اور قارئین پشتو ادب سے اپنی انفرادیت کا لوہا منوا چکے ہیں لیکن ان کی شاعری پر تفصیلی بحث یہاں ممکن نہیں ۔

انگریزی اور اردو ادب کے زیراثر پشتو شاعری میں بھی آزاد نظم (Free Verse) کے تجربے کئے گئے ہیں۔ اس ضمن میں سید رسول رسا اور فضل حق شیدا کے نام لئے جا سکتے ہیں ۔ جنہوں نے زمانہ طالب علمی میں اس صنف کو پشتو شاعری میں رائج کیا تھا ۔ اس کے بعد ارباب ہدایت اللہ ' غنی خان ' اشرف مفتون اور یونس خلیل نے آزاد نظموں کے کامیاب تجربے کئے ہیں ۔ اگرچہ ان میں اکثر نظمیں نیم آزاد اور معریٰ تھیں ' لیکن پھر بھی قارئین نے بے حد پسند کی ہیں ۔

قیام پاکستان کے بعد اس صنف سخن میں قلندر مومند ' مرلو شنواری ' رشدی علی دہقان ' لطیف وہمی اور ارباب رشید نے بھی طبع آزمائی کی ہے ۔ جن کی کاوشوں کو بے حد سراہا گیا ہے ۔ اس کے بعد ایک مختصر عرصے کے لئے اس صنف سے بے توجہی برتی گئی ہے ۔ پھر جب اس کی مقبولیت اور جدت کی راہ ہموار ہوئی تو بیشتر شعراء نے اس کی طرف توجہ مبذول کی ہے ۔ مثلاً ایوب صابر ' ہاشم بابر ' پریشان خٹک ' تقی ہاشمی ' نواز طائر ' عرب خان عرب ' رب نواز مائل ' اسلام ارمانی ' فوزیہ انجم ' سلیم راز وغیرہ ۔

اگرچہ آزاد نظم نے جدید پشتو شاعری میں ایک مستقل اور قابل قبول صنف کی حیثیت حاصل کی ہے ' لیکن نثری نظم (Prose Verse) کو تاحال درخور اعتناء نہیں سمجھا گیا ہے ۔

پشتو ادب میں تنقید و تحقیق کی جو کمی ابتداء سے محسوس کی جاتی تھی ' جدید دور میں اس کی کافی حد تک تلافی کی گئی ہے ۔ پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی نے بھی اس سلسلے میں گرانقدر خدمات انجام دی ہیں ۔ اب تک جو تحقیقی آثار سامنے آئے ہیں وہ معیار اور مقدار کے لحاظ سے جدید تقاضوں سے کافی حد تک مطابقت رکھتے ہیں اور علمی شعور اور تنقیدی بصیرت سے مالا مال ہیں ۔

جدید پشتو ادب میں نظریاتی اور عملی دونوں طرح کے تحقیقی آثار اور تنقیدی مقالات موجود ہیں ۔ اب تک جن محققین اور نقادوں کے شہ پارے منظرعام پر آ چکے ہیں ۔ وہ قدیم اور جدید ادب کے مختلف شعراء و ادباء اور مختلف اصناف سخن کے بارے میں لکھے گئے ہیں ۔ فن تنقید پر بھی کئی کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ یہاں اختصار کو مدنظر رکھتے ہوئے صرف ان محققین اور نقادوں کے نام پیش کئے جاتے ہیں ' جنہوں نے تنقید اور تحقیق کے سلسلے میں پشتو ادب کی آبیاری کی ہے : دوست محمد کامل ' قلندر مومند ' سید رسول رسا ' فضل حق شیدا ' قمر راہی ' عبدالکریم اثر ' مہدی شاہ مہدی ' سلطان محمد صابر ' ولی محمد طوفان ' یوسف اورکزئی ' بیش خلیل ' سید تقویم الحق کاکاخیل ' ایوب صابر ' سحر یوسفزئی ' تقی ہاشمی ' رحمت اللہ درد ' رب نواز مائل ' افضل رضا ' خواجہ سائل ' حسن خان سوز ' عبدالکافی ادیب ' ہمایوں ہما ' ڈاکٹر اقبال نسیم ' محمد اعظم اعظم ' راجولی شاہ خٹک ' پردل خٹک ' نواز طائر ' نور شاہ جہاں انور ' صاحبزادہ حمید اللہ ' سیال کاکڑ ' ابوالخیر حلونہ ' حبیب اللہ رفیع وغیرہ ۔

مذکورہ نقادوں اور عالموں نے مغربی تعلیم کے زیراثر پشتو ادب کے مختلف پہلوؤں پر علمی و ادبی لحاظ سے سیرحاصل تبصرہ کیا ہے اور یوں پشتو زبان و ادب کو عالمی ادب سے ہمکنار کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اگر ایک طرف ان کے تخلیقی و تنقیدی مضامین اور مقالوں میں گہرائی اور گیرائی ہے تو دوسری طرف وہ عوام اور خواص

دونوں کے لئے دلچسپی کا سامان بھی مہیا کرتے ہیں ۔

دور حاضر میں پشتو کے بیشتر علماء نے انگریزی 'عربی 'فارسی اور اردو ادب کے شاہکار پشتو زبان میں ترجمہ کئے ہیں ۔ اگرچہ اس قسم کے تراجم قدیم دور میں بھی ہوئے ہیں لیکن ان میں کافی حد تک لسانی رولبط اور عصری آگہی کے شعور کا فقدان تھا ۔ ترجمہ ایک فن ہے اور فنون کی طرح اس کا بھی ایک مخصوص تکنیک اور چند چیدہ چیدہ اصول و قواعد ہیں جو ایک کامیاب اور معیاری ترجمے کی ضامن ہیں ۔ علاوہ ازیں مترجم کی اپنی زبان اور جس زبان سے وہ ترجمہ کر رہا ہو 'دونوں پر کامل عبور ہونا چاہئے ۔ منثور ترجمے کے مقابلے میں منظوم ترجمہ نسبتاً مشکل ہوتا ہے ۔جس سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہونا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے ۔

پشتو زبان میں علامہ اقبال ؒ کے فارسی اور اردو کلام کے منظوم تراجم پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی نے مولانا عبدالقادر (مرحوم) کی سربراہی میں حمزہ شنواری 'سمندر خان سمندر 'سید تقویم الحق کاکاخیل 'عبدالحلیم اثر 'شیر محمد مینوش اور راحت زاخیلی سے کروائے تھے ۔ اس کے علاوہ علامہ اقبال کی مشہور نثری تصنیف Reconstruction of Islamic Thought کو سید الابرار (مرحوم) نے پشتو نثر میں منتقل کیا ہے ۔ یہ جملہ تراجم 'ترجمہ کے فن کا احاطہ کئے ہوئے ہیں ۔ اسی طرح سے حمزہ شنواری 'فارغ بخاری اور رضا ہمدانی نے دیوان رحمان بابا کا مکمل منظوم اردو ترجمہ بھی کیا ہے ۔ یہ دونوں تراجم (یعنی فارغ بخاری اور رضا ہمدانی کا مشترکہ ترجمہ اور حمزہ شنواری کا ترجمہ) اپنی اپنی نوعیت کے لحاظ سے معیاری ہیں ۔ "مسدس حالی" کا منظوم پشتو ترجمہ غلام محمد خان پوپلزئی (چارسدہ) نے اور قلندر مومند نے ہڈسن کی مشہور کتاب "این انٹروڈکشن ٹودی سٹڈی آف لٹریچر" کے ایک باب کا ترجمہ "تنقید" کے نام سے کیا ہے ۔ سید امیر علی کی شہرہ آفاق تصنیف "دی سپرٹ آف اسلام" کا پشتو ترجمہ قاضی ہدایت اللہ (مرحوم) اور ڈاکٹر اقبال نسیم نے اسی نام سے کیا ہے اور پشتو اکیڈمی نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا ہے ۔ سید عبدالکافی ادیب نے "میلینم او کرزاو سوات پہ پشتو کنبے" (میلنیم اور کرزا سوات کے پشتونوں میں) کے نام سے ڈاکٹر اکبر ۔ ایس احمد کی کتاب کو پشتو زبان میں منتقل کیا ہے ۔

ارسطو کی مشہور تصنیف "Poetics" کا جو کہ ہر زبان کی تنقید میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے 'پشتو ترجمہ مولوی محمد اسرائیل نے "کتاب الشعر" اور قلندر مومند نے "نظمیات" کے ناموں سے کیا ہے (جبکہ اسی تصنیف کا اردو ترجمہ عزیز احمد نے "بوطیقا" کے نام سے کیا ہے)۔دونوں ترجمے معیاری ہیں اور ان میں ارسطو کے تنقیدی شعور اور نظریات کو پشتو زبان کا جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے ۔

سیرت النبی ؐ جو کہ حضرت شبلی نعمانی ؒ اور حضرت مولانا سید سلمان ندوی ؒ کی شہرہ آفاق تصنیف ہے 'کی پہلی جلد کا ترجمہ عبدالکریم مظلوم اور باقی پانچ جلدوں کا مولانا محمد اسرائیل نے کیا ہے اور پشتو اکیڈمی نے پہلی تین جلدوں کو زیور طبع سے آراستہ کیا ہے ۔ محمد نواز طائر نے قاضی نذرالاسلام کی نظموں کا منظوم پشتو ترجمہ "بنگالی سندرے" (بنگالی گیت) کے نام سے کیا اور مولانا عبدالقادر نے ۱۹۶۳ء میں پشتو اکیڈمی سے شائع کیا ۔ سید مظفرالدین ندوی کی تصنیف "Muslim Thought Its Source" کا ترجمہ قاضی ہدایت اللہ (مرحوم) نے "د اسلامی فکر ماخذ" (اسلامی

فکر کا ماخذ) کے نام سے کیا اور پشتو اکیڈمی نے ۱۹۶۳ء میں شائع کیا۔ مستشرقین نے بھی پشتو شعر و ادب کے انگریزی تراجم کئے ہیں ۔ میجر راورٹی نے خوشحال خٹک کی ۱۰۰ نظموں کا اور جنرل انولڈسن نے رحمان بابا کی پچاس غزلوں کا منظوم انگریزی ترجمہ کیا ہے ۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار تراجم ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے ۔

انشائیہ (Essay)، جسے پشتو میں "نکل" کا نام دیا گیا ہے، پر بھی پشتو کے جدید نثر نگاروں نے طبع آزمائی کی ہے، شگفتگی اور سنجیدگی انشائیہ کو طنز و مزاح سے علیحدہ کرتے ہیں ۔ پشتو میں اب تک جو انشائیے لکھے گئے ہیں، ان میں یہ عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں ۔ سنوبر حسین کاکاجی اور سید راحت زاخیلی نے انشائیہ کو پشتو ادب میں متعارف کرایا۔ پشتو زبان کے بیشتر علماء اس بات پر متفق ہیں کہ انشائیہ "اولسی ادبی جرگہ" جو کہ پشتو زبان و ادب کی ایک فعال اور متحرک تنظیم تھی، کی دریافت ہے ۔ ذیل میں چند انشائیہ نگاروں اور ان کے انشائیوں کے نام دیئے جاتے ہیں : مولانا عبدالقادر (مرحوم) کا "ڈنکوبیا"، حمزہ شنواری کا "اگر میں وزیر ہوتا"، میاں احمد شاہ کا "آزادی کی بربادی"، عبدالخالق خلیق کا "انقلاب زندہ باد"، دوست محمد کامل (مرحوم) کا "تحرو"، قلندر مومند کا "پلوشہ"، ایوب صابر کا "دارالکتابت"، میر مہدی شاہ مہدی کا "کننگھم پارک" وغیرہ انشائیہ نگاری کے اعلیٰ اور بہترین نمونے ہیں ۔ اس کے علاوہ ماسٹر عبدالکریم، اشرف مفتون، رشید علی دہقان، لطیف وہمی، ہمیش خلیل، مراد شنواری، سید تقویم الحق کاکاخیل، سعد اللہ جان برق وغیرہ نے بھی انشائیے لکھے ہیں ۔ مذکورہ انشائیوں میں پشتونوں کی روایات کو سمونے کے ساتھ ساتھ پشتو زبان کے محاوروں، اصطلاحات، ضرب الامثال اور لغات کو بھی نہایت خوبصورتی کے ساتھ مستعمل کیا گیا ہے لیکن اس کے باوجود انشائیہ کو جو وقعت اور اہمیت دی جانی چاہیئے تھی، وہ اب تک نہیں دی گئی ہے ۔

طنز و مزاح نے جدید پشتو ادب میں ایک مستقل اور قابل قبول صنف کی حیثیت حاصل کی ہے ۔ نظم و نثر دونوں میں اس کا اظہار کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ نہ صرف نثر نگار بلکہ بعض شاعر بھی مزاح نگار اور طنز نگار جیسے ناموں سے موسوم کئے جاتے ہیں ۔ طنز و مزاح سے نہ صرف تفریح طبع کا کام لیا جاتا ہے بلکہ یہ اصلاح کا بھی ایک بہترین اور موثر ترین ذریعہ ہے ۔ پشتو میں طنز و مزاح کے ابتدائی دور میں غنی خان، راحت زاخیلی، عبدالخالق خلیق، اجمل خٹک، نواز خٹک، سمندر خان سمندر، حمزہ شنواری وغیرہ کے نام شامل ہیں ۔ دوسرے دور میں بے شمار نثر نگاروں نے طنز و مزاح کو وسعت دے کر اسے زندگی کے گوناگوں معاشرتی، معاشی اور سماجی مسائل کی ترجمانی سے ہمکنار کیا ہے ۔ اس کے علاوہ اسی دور میں بعض نثر نگاروں نے مخصوص فرضی ناموں سے بعض اخبارات اور رسائل کے فکاہی کالموں میں بھی طنز و مزاح پر قلم اٹھایا ہے اور معاشرے پر حالات حاضرہ کی روشنی میں نہ صرف طنز کی ہے بلکہ مزاح کو بھی تفریح طبع کے طور پر اپنایا ہے ۔ اسی طرح سے ریڈیو اور ٹی وی نے بھی بعض سلسلہ وار پروگرام طنز و مزاح کے لئے مخصوص کئے ہیں، جن سے پشتو نثر نگاروں کی طنزیہ اور مزاحیہ نگارشات نشر ہوتی ہیں ۔ یہ پروگرام عوام میں بے حد مقبول ہیں ۔

سفرناموں یا سیاحت ناموں میں عموماً کسی قوم کے تاریخی، جغرافیائی اور معاشرتی حالات اور رسم و رواج کی عکاسی کا خیال رکھا جاتا ہے ۔ پشتو ادب میں بھی اس نوعیت کے سفرنامے لکھے گئے ہیں، جو مصنفین کے ذوق، زاویہ نگاہ اور فطری رجحان کی ترجمانی کرتے ہیں ۔ پشتو ادب میں سیاحت نامے کی ابتدا خوشحال خان خٹک نے "سوات نامہ" لکھ کر

کی ۔ میاں نعمان الدین کاکاخیل نے " سفرنامہ ابن بطوطہ " کا پشتو ترجمہ کیا ہے ۔ امیر علی خان خٹک نے " مقالات امیر " کے نام سے بھی ایک سفرنامہ لکھا تھا۔ آج کل یہ دونوں سفرنامے نایاب ہیں ۔ میاں اکبر شاہ نے " د آزادی تلاش " (آزادی کی تلاش) کے نام سے ایک سیاحت نامہ لکھا' جس میں اس کے روس کے سفر کا آنکھوں دیکھا حال درج ہے ۔ اسی طرح سے عبدالاکبر خان اکبر نے " د روسی ترکستان سفر " (روسی ترکستان کا سفر) کے نام سے سفرنامہ تحریر کیا' جس میں اس نے روسی ترکستان میں اپنے سفر کے تاثرات قلمبند کئے ہیں ۔ " نالیدلے سوات " (ان دیکھا سوات) میں نواز طائر نے سوات کے ان گوشوں کو بے نقاب کیا ہے جو سیاحوں کی نظروں سے اوجھل تھے ۔ " د حجاز پہ لور " (حجاز مقدس کی طرف) میں ' حمزہ شنواری نے خشکی کے راستے حج بیت اللہ شریف کا جو سفر کابل ' روس ' ایران ' عراق اور سعودی عرب کے راستے اختیار کیا تھا ' اپنے احساسات بیان کئے ہیں ۔ اسی طرح سے طاہر آفریدی نے بھی " سفرِخیبر " (سفرِخیبر) کے نام سے سفرنامہ لکھا ہے ' جو سنگاپور کے سفر پر مبنی ہے اور ۱۹۸۵ء میں چھپ گیا ہے ۔ قانتہ بیگم نے " زما سفر " (میرا سفر) کے نام سے بھی ایک سفرنامہ لکھا ہے ۔

جدید شعراء ادباء کو متعارف کرانے کے لئے جدید ادب میں تذکرہ نگاری نے بھی ایک اہم مقام حاصل کیا ہے ۔ اگرچہ تذکرہ نگاری کا یہ فن قدیم دور سے چلا آرہا ہے ' لیکن جدید دور نے اس کو مزید وسعت دی ہے ۔ دور حاضر میں پشتو زبان و ادب میں دو طرح کے تذکرے لکھے گئے ہیں اور لکھے جا رہے ہیں ۔ ایک قسم کے تذکرے میں صوبہ سرحد کے تمام پشتون شعراء و ادباء کو بلاامتیاز علاقہ متعارف کرایا جاتا ہے ۔ مثلاً بخش خلیل کا " پختانہ لیکوال " (پشتون اہل قلم) اور فرمان مسافر کا " حلنڈہ ستوری " (روشن ستارے) وغیرہ ۔ جبکہ دوسری قسم کے تذکرے اپنے اپنے علاقوں کے اہل قلم کے تذکروں پر مشتمل ہیں ۔ مثال کے طور پر مرلو شنواری کا تذکرہ " د خیبر ادب " (خیبر کا ادب) ' رحیم شاہ رحیم کا " واورینے ڑوکے (برفانی چوٹیاں) وغیرہ ۔ موخرالذکر کی نسبت اول الذکر تذکرے افادیت اور اہمیت کے حامل ہیں ۔

افسانوی ادب دنیا کے جدید ادب میں بنیادی اہمیت کا حامل ہوتا ہے ۔ اگرچہ افسانہ 'ناول اور ڈراما انگریزی ادب کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے ' لیکن پشتو کے ادباء نے مذکورہ اصناف کو اپنے ماحول اور معاشرتی حالات سے جس خوبی سے ہم آہنگ کیا ہے ' اس نے ان اصناف سے وابستہ اجنبیت اور غیریت کے احساس کو کافی حد تک کم کیا ہے لہٰذا پشتو ادب میں نفسیاتی ' معاشرتی اور معاشی نظریات پر مبنی افسانے ' ناول اور ڈرامے اس کی واضح مثالیں ہیں ۔

زندگی کی گوناگوں مصروفیات نے قصے کی طوالت کو افسانے کی تکنیک میں ڈھال کر اختصار کی راہ پیدا کی ہے ۔ پشتو زبان میں افسانے کی ابتداء سید راحت زاخیلی نے ۱۹۱۷ء میں " کونڑہ جینئی " (کنواری بیوہ) اور ۱۹۱۹ء میں " شلیدلے پنڑہ " (پھٹا ہوا جوتا) جیسے افسانے لکھ کر کی ۔ اول الذکر افسانہ اس دور کے مشہور اخبار " افغان " میں چھپا تھا ۔ سید راحت زاخیلی نے جب افسانے لکھنے شروع کئے تو اس وقت برصغیر میں آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اور سماجی برائیاں ہر طرف پھیلی ہوئی تھیں ۔ چنانچہ راحت زاخیلی کے افسانے اسی فضا اور ماحول کی پیداوار تھے ۔

راحت زلنخیلی سے طاہر آفریدی کے افسانوں کے مجموعے "لارہ کبنس ماسبنام" (راستے میں شام) یعنی ۱۹۸۷ء تک بے شمار افسانے اور افسانوں کے مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جو مقدار اور معیار دونوں کے لحاظ سے پشتو افسانوی ادب میں قابل قدر اضافے کے باعث بنے ہیں ۔ جن کا فرداً فرداً ذکر اس مختصر مقالے میں ممکن نہیں ۔ تاہم پشتو افسانے کا پہلا دور ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۷ء تک ہے' جبکہ دوسرا دور قیام پاکستان کے بعد شروع ہوتا ہے ۔

ڈاکٹر محمد اعظم اعظم نے اپنی تحقیق "پشتو افسانہ" میں افسانہ کا ارتقاء اور فن افسانہ نگاری پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے ۔ پشتو میں کئی افسانوں اور افسانوں کے مجموعوں کے تراجم بھی اردو میں کئے گئے ہیں ۔ اسی طرح سے اردو کے کئی شاہکار افسانوں کو پشتو میں منتقل کیا گیا ہے ۔ مردوں کے ساتھ ساتھ بے شمار خواتین افسانہ نگاروں نے بھی اپنے اپنے رنگ میں افسانے لکھے ہیں ۔ جن میں زیتون بانو کا نام سرفہرست ہے ۔

پشتو میں ناول کی ابتدا بیسویں صدی کے آغاز میں ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں کے ترجمے سے ہوتی ہے ۔ میاں محمد یوسف کاکاخیل نے "توبتہ النصوح" اور میاں حبیب گل کاکاخیل نے "مراۃ العروس" اور "نقش نگین" کا پشتو میں ترجمہ کیا۔ ان تمام تراجم میں زبان اور محاورے کا خاص خیال رکھا گیا ہے' اس کے بعد سید راحت زلنخیلی نے "نتیجہ عشق" اور حمزہ شنواری نے "نوے چپے" (نئی موجیں) اور "نوے پشتون" (نیا پشتون) جیسے طبعزاد ناول لکھے ۔ صاحبزادہ محمد ادریس نے "پیغلہ" (دوشیزہ) اور سید رسول رسانے "مفرور" "ماموئی" "خودکشی" اور "شبھی" جیسے ناول لکھ کر پشتو ادب میں فن ناول نگاری کو جلا بخشی ہے ۔ اسی طرح سے شیر زمان خمڑن نے "امانت" "گل خان اور رحمن کورونہ" کے نام سے ناول لکھے ہیں ۔ اس کے علاوہ عبداللہ جان اسیر کا "درس عبرت" 'محمد ابراہیم شبنم کا "خواخ اشرور" (بہو اور ساس) ' رشید علی دہقان (مرحوم) کا "دسرو تعویز" (سنہری تعویز) 'اشرف درانی کا "زرکے ستر گے" (چکوری آنکھیں) اور ساغر آفریدی کا "نوے کول" (نئی نسل) فن ناول نگاری میں قابل قدر اضافے ہیں۔ حبیب افغانی نے "مینہ اور فرض" (محبت اور فرض) اور "خاپیرئی" (پری) جیسے ناول لکھے ہیں۔ امیر منگل کا "ترلہ" (چچا کی لڑکی) اور غازی سیال کے "بنزے" (سوتیلا لڑکا) پشتو ادب کے ناول میں گرانقدر اضافے ہیں جو کہ زیور طبع سے آراستہ ہوئے ۔ لیکن اس کے باوجود جو شہرت صاحبزادہ محمد ادریس کے "پیغلہ" (دوشیزہ) کو حاصل ہوئی وہ کسی اور ناول کو نصیب نہیں ہوئی ۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ ناول کو تکنیک اور موضوع کے لحاظ سے پشتو کا اولین ناول تصور کیا جاتا ہے ۔ اس میں تعلیم یافتہ طبقے کی نمائندگی کی گئی ہے اور موضوع کو جس خوبصورتی سے ناول کے فن کا جامہ پہنایا گیا ہے وہ ناول نگار کی فن ناول نگاری میں مہارت کی دلیل ہے ۔ بہرحال پشتو ادب کے دانشور اور اہل قلم پشتو زبان میں ناول کے شاندار اور روشن مستقبل سے مایوس نہیں ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ افسانوی ادب سے دلچسپی رکھنے والے اہل قلم پشتو ادب میں ناول کے معیار کے سلسلے میں جو کمی اب تک محسوس کی جاتی ہے' اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے' پوری کریں گے ۔

پشتو میں سب سے پہلے ۱۹۴۷ء میں عبدالاکبر خان اکبر نے "درے یتیمان" (تین یتیم) کے نام سے ڈراما لکھا جو ہائی سکول اتمان زئی (چارسدہ) میں سٹیج ہوا تھا' یہ معاشرے کی اصلاح پر مبنی تھا۔ اس کے بعد اور بھی کئی ڈرامے

سٹیج کے لئے لکھے گئے ۔ ۱۹۲۸ء میں قاضی رحیم اللہ نے "نوے روشنی" (نئی روشنی) کے نام سے ڈراما لکھا جو کتابی صورت میں چھپ گیا ہے ۔ انگریز سامراج کے خلاف ۱۹۳۰ء میں جو ڈراما سٹیج ہوا تھا وہ امیرنواز خان جلیا کا لکھا ہوا "درد" ڈراما تھا اور برطانوی حکومت نے پیش کرنے والوں کو عبرتناک سزائیں دی تھیں ۔ اسی سال عبدالخالق خلیق نے "خدائی خدمتگار" اور میاں عبدالرزاق نے "د جنت ماڼئی" (جنت کا محل) کے ناموں سے ڈرامے لکھے جو سٹیج کئے گئے ۔ اسلم خٹک نے "د وینو جام" (خون کا پیالہ) کے نام سے جو ڈرامہ لکھا تھا وہ ۱۹۳۵ء میں ریڈیو سے بھی نشر ہوا تھا۔ ابتدائی دور میں سٹیج کے لئے لکھے گئے ان ڈراموں میں مذکورہ ڈرامے کو بے پناہ شہرت حاصل ہوئی ہے ۔ یہ نہ صرف پلاٹ ،کردار ، واقعات اور ماحول کے لحاظ سے ایک مکمل ڈراما ہے بلکہ اس میں پشتونوں کی تہذیب و تمدن اور ثقافت کی بھی بھرپور عکاسی کی گئی ہے ۔ اسی طرح سے عبداللہ جان اسیر نے "درس عبرت" کے نام سے ڈراما لکھا جو کتابی صورت میں شائع ہوا ۔ عبدالخالق نے دو اور ڈرامے "شہیدہ سکینہ" اور "خوژ ژوندون" (پیاری زندگی) کے ناموں سے لکھے جو کتابی صورت میں چھپ گئے ۔ یہ اصلاحی ڈرامے ہیں جن میں پشتون کی فرسودہ رسم و رواج کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے اور سماجی اور معاشرتی برائیوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ خاص کر عورتوں پر جو مظالم ڈھائے جاتے ہیں ان کی نشان دہی کی گئی ہے ۔ ۱۹۴۵ء میں عبدالاکبر خان اکبر نے ایک اور ڈراما "جوگڑہ" (جھونپڑی) کے نام سے لکھا جو سٹیج ہوا تھا ۔ یہ بھی انگریز سامراج کے خلاف جنگ و جدل اور آزادی حاصل کرنے کے موضوع پر مبنی تھا۔ فضل رحیم ساقی نے "سپیرہ مرگے" (منحوس موت) کے نام سے ایک ڈراما سٹیج کے لئے تصنیف کیا۔ سید رسول رسا کا ڈراما "د ژوند دوزخ" (زندگی کا دوزخ) ۱۹۷۳ء میں کتابی صورت میں چھپ گیا ہے ۔

مذکورہ ڈراموں کے علاوہ ریڈیو کے لئے بھی بے شمار ڈراما نگاروں نے ڈرامے لکھے ہیں ۔ چنانچہ ۱۹۳۵ء میں حمزہ شنواری کا لکھا ہوا ڈراما "زمیندار" ریڈیو سے نشر ہوا ۔ اسی طرح سے اور بھی بے شمار ڈراما نگاروں کے ڈرامے ریڈیو سے نشر ہوئے ہیں ۔ علاوہ ازیں ٹی وی کیلئے بھی کئی ڈرامے لکھے جا چکے ہیں ۔

تکنیک اور موضوع کے لحاظ سے سفرنامہ اور رپورتاژ میں معمولی فرق ہوتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات کسی رپورتاژ کو سفرنامہ اور سفرنامہ کو رپورتاژ تصور کیا جاتا ہے ۔ پشتو میں اس کی بہترین مثال محمد نواز طائر کے سفرنامے "بلید لے سوات" (ان دیکھا سوات) کی صورت میں موجود ہے ۔ مصنف نے کتاب کے "پیش لفظ" میں اسے رپورتاژ قرار دیا ہے ۔ لیکن در حقیقت یہ رپورتاژ نہیں بلکہ سفرنامہ ہے ۔ اسی طرح سے اور بھی کئی رپورتاژ لکھے گئے ہیں ۔ نصراللہ خان نصر کا "د امب سفر" (ریاست امب کا سفر) ایک مشہور رپورتاژ ہے ۔ جس میں انہوں نے ریاست امب کے سفر کے دوران پیش آنے والے واقعات اور وہاں کے لوگوں کی مہمان نوازی کے بارے میں اپنے تاثرات قلمبند کئے ہیں ۔ اجمل خٹک نے "واژۂ پاگل ووم" (کیا میں پاگل تھا) میں اپنی قید کے دوران سفر اور مختلف واقعات کا نقشہ نہایت خوبصورت انداز سے کھینچا ہے ۔ ہمیش خلیل کا "قید و بند" بھی اس کے ذاتی تاثرات کا ایک حسین مرقع ہے ۔ اسی طرح سے میر مہدی شاہ مہدی کا "تر اصحاب بابا پورے" (اصحاب بابا تک) ،ایوب صابر کا "د کوہاٹ نہ تر لورالائی پورے" (کوہاٹ سے لورالائی تک) اور "د آزا خیلو پہ لور" (آزاد خیل کی جانب) ،رشید علی خان

دہقان کا " ما پہ گناہگار و سترگو واحرخہ لیدلی دی " (میں نے اپنی گناہگار آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھا ہے) ' حسن خان سوز کا " د ملکہ سفر " (ملکہ کا سفر) " لطیف وہمی کا " د تیراہ سفر " (تیراہ کا سفر) اور " دپیبنو رنہ تخت بائی پورے " (پشاور سے تخت بھائی تک) قابل ذکر رپور تاژ ہیں جدید دور میں پشتونوں کی تاریخ اور انساب پر تحقیق کرنے کے سلسلے میں اب تک جتنا کام کیا گیا ہے ' اس سے بھی زیادہ اس موضوع پر کام کرنے کی گنجائش ہے تاکہ یہ قطعی طور پر معلوم ہو سکے کہ پشتون آرین النسل ہیں یا سامی النسل ؟ افغانستان کے بیشتر علماء پشتونوں کو آرین النسل مانتے ہیں جبکہ صوبہ سرحد کے دانشور اور مورخ ان کو سامی نسل کہتے ہیں ۔ بہرحال اس سلسلے کی اولین کوشش " تاریخ مرصع " ہے جو کہ افضل خان خٹک کی تصنیف ہے ۔ افضل خان خٹک ' اشرف خان ہجری کا لڑکا اور خوشحال خان خٹک کا پوتا ہے ۔ یہ تاریخ قدیم عہد سے لے کر مؤلف کے عہد تک افغانوں کی تاریخ اور انساب پر مشتمل ہے ' جو کہ ایک بہت اہم اور مفید علمی و ادبی کارنامہ ہے ۔ تاریخ ہذا کی ترتیب و تدوین دوست محمد کامل نے کی ہے ۔ " The Pathans " مشہور مستشرق سراولف کیرو کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے ' جس کا اردو میں بھی ترجمہ کیا گیا ہے ۔ اس کے بعد قاضی عطاء اللہ کی " دپختنو تاریخ " (پشتونوں کی تاریخ) جو کہ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے ' ایک مستند تاریخ کا درجہ رکھتی ہے ۔ اسی طرح سے تاریخ حافظ رحمت خانی ' میاں بہادر شاہ ظفر کاکا خیل کی " پختانہ د تاریخ پہ رنڑا کبنس " (پشتون تاریخ کی روشنی میں) اور اللہ بخش یوسفی کی " یوسف زئی افغان " قابل ذکر تصنیفات ہیں ۔ پریشان خٹک کی " پشتون کون ؟ " اس سلسلے کی آخری کتاب ہے ۔ اگرچہ اس سے پہلے عبدالحلیم اثر نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور بے شمار تحقیقی مقالات لکھے ہیں لیکن اس کی اس بارے میں کوئی کتاب اب تک چھپی نہیں ہے ۔

اس کے علاوہ پشتو میں اب تک جو دیگر تاریخی کتابیں لکھی گئی ہیں ۔ ان میں فضل حق شیدا کی " جمال الدین افغان " ' عبدالخالق کی " د آزادی جنگ " (جنگ آزادی) اور " زۂ اور زما زمانہ " (میں اور میرا زمانہ) ' سرفراز خان عقاب خٹک کی " تاریخ خٹک " ' خان میر ہلالی کی " توریالی " (شمشیر زن) ' جعفر حسین شاہ ریشنونے کی " تاریخ بنگش " ' سلطان محمد صابر کی " خپلواکی او پاکستان " (خود مختاری اور پاکستان) گل ایوب سیفی کی " د بنوں او وزیرستان تاریخ " (تاریخ بنوں اور وزیرستان) ' عبدالرؤف نوشہروی کی " خکلے پاکستان " (حسین پاکستان) اور افضل رضا کی " د ولازاکو پختنو تاریخ " (تاریخ ولازاک پشتون) قابل ذکر تصانیف ہیں ۔ جدید پشتو ادب میں مختلف ادبی تنظیموں نے بھی کارہائے نمایاں انجام دی ہیں ۔ جن میں " اولسی ادبی جرگہ " (عوامی ادبی جرگہ) سرفہرست ہے ۔ مذکورہ ادبی جرگے کا قیام ۱۹۴۷ء میں عمل میں لایا گیا تھا ۔ صنوبر حسین مہمند کاکاجی ' دوست محمد کامل اور حمزہ شنواری اسکے سرپرست تھے ۔ جبکہ اجمل خٹک ' حسین بخش کوثر ' ولی محمد طوفان ' مہدی شاہ مہدی ' صاحبزادہ فیضی ' قلندر مومند ' سیف الرحمان سلیم ' ہمیش خلیل ' لطیف وہمی ' سردار خان فنا ' ایوب صابر ' افضل بنگش ' ساجع مظہری ' طالب تاجک وغیرہ بھی اس سے کسی نہ کسی طرح سے وابستہ رہے ہیں ' " اولسی ادبی جرگہ " ۱۹۶۳ء تک جدید پشتو ادب کی آبیاری کرتا رہا ۔ اس کے بعد بے شمار ادبی تنظیمیں عمل میں لائی گئیں ' جو آج تک پشتو ادب کی خدمت اور ترویج و ترقی میں ہمہ تن مصروف ہیں ۔

کتابیات

۱۔ جدید پشتو ادب۔ — ایوب صابر

۲۔ پختانہ لیکوال۔ — ہمیش خلیل

۳۔ حلنڈرہ ستوری۔ — فرہان مسافر

۴۔ پشتو ادب۔ — عبدالحلیم اثر

۵۔ خورے پاڑے۔ — عبدالکافی ادیب

۶۔ سباؤن۔ — قلندر مومند

۷۔ پنبتو۔ نثر (انتخاب) — جہانزیب نیاز، محمد اعظم اعظم، افضل رضا

۸۔ ادبیات سرحد۔ — فارغ بخاری اور رضا ہمدانی
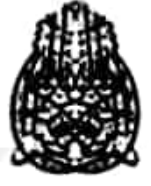
۹۔ اٹک کے اس پار۔ — فارغ بخاری، رضا ہمدانی

۱۰۔ بکھرے اوراق۔ — عبدالکافی ادیب

سہ ماہی

ادبیات

اسلام آباد

شمارہ: ۱۳-۱۴-۱۵ جلد ۴

مدیر مسئول
غلام ربانی آگرو

مدیر اعلیٰ
خالد اقبال یاسر

اکادمی ادبیات پاکستان ○ اسلام آباد

سہ ماہی
ادبیات